Volume 03, Issue 02,
April-June 2025
PP: 56-69
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN
Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X
https://doi.org/10.63283/IRJ.03.02/04

افتخار عارف کی غزل کا مابعد جدید مطالعہ (لامرکزیت اور مہابیانیہ کے تناظر میں)

A Postmodern Analysis of Iftikhār ʿĀrif's Ghazal: In the Context of Decentralization and Maḥābayāniyya

Yasir Abbas Faraz[1], Dr. Muhammad Obaid Ullah[2]

Article History

Received
02-04-2025

Accepted
04-05-2025

Published
06-05-2025

Indexing

Abstract

Postmodernism signifies a profound epistemological shift an intellectual rupture that challenges the authority of centralized meanings, objective truths, and overarching maḥābayāniyyāt (grand narratives). As Jean-François Lyotard famously declared the "incredulity toward metanarratives," and Jacques Derrida introduced deconstruction as a strategy to expose internal contradictions within texts, the notion of fixed meaning began to collapse. Meaning, in the postmodern framework, is no longer a stable endpoint but a deferred, slippery construct shaped by language, context, and subjectivity. This theoretical landscape repositions the reader as an active agent navigating a text that resists interpretive finality. Within this context, the ġazal of Iftikhār ʿĀrif emerges as a compelling site of postmodern inquiry. While formally rooted in classical Urdu poetics, his ġazals subvert traditional boundaries by engaging civilizational, religious, and national discourses not with resolution, but with profound ambiguity. Through layered symbolism, semantic openness, and deliberate linguistic complexity, ʿĀrif's poetry disrupts narrative authority and invites multiple, often conflicting, interpretations. His use of intertextual references and metaphorical plurality dismantles the illusion of a singular, unchanging truth.

Rather than reinforcing identity or ideology, ʿĀrif's ġazal participates in their deconstruction, rendering meaning fluid and elusive. This decentering process aligns closely with postmodern sensibilities—where silence speaks, gaps signify, and absence becomes a form of presence. In this light, Iftikhār ʿĀrif is not merely a modern poet but a postmodern voice, articulating a poetic ethos that unsettles every interpretive center and resists being confined to any maḥābayānī frame.

Keywords:

Postmodernism, Deconstruction, Metanarrative, Différance, Local Narrative, Intertextuality, Ambiguity, Symbolism, Semantic Openness, Narrative Authority, Iftikhār ʿĀrif, Urdu Poetry.

[1] *Ph.D Scholar, Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur.*
yasirfraz9@gmail.com
[2] *Assistant Professor, Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur.*
muhammad.obaid@iub.edu.pk

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

HIRA INSTITUTE
of Social Sciences Research & Development

مابعد جدیدیت ایک فکری انحراف ہے، ایک ایسا ادراکی موڑ جو مرکز، صداقت اور بیانیے کی روایت شدہ ساخت کو متزلزل کرتا ہے۔ ژاں فرانسوا لیوتار کے نزدیک یہ وہ لمحہ ہے جہاں مہابیانیے اپنی معنوی بالادستی کھو بیٹھتے ہیں اور دریدا کی ساخت شکنی مفہوم کو مرکز سے ہٹا کر لامتناہی التواء میں داخل کر دیتی ہے۔ اس فکری تناظر میں قاری متن میں ایسے لاینحل سوالات سے دوچار ہوتا ہے جو ہر مرکز کو بے یقین کر دیتے ہیں۔

اسی منظر نامے میں افتخار عارف کی غزل محض کلاسیکی حسنِ بیان نہیں، بلکہ قومی، مذہبی اور تہذیبی بیانیوں کی باطنی شکست کا ایک شعری اظہار ہے۔ اس کے اشعار میں علامتیں، ابہام اور لسانی تہہ داری اس طرح گندھی ہوئی ہیں کہ مفہوم کسی ایک مرکز پر قرار نہیں پاتا۔ تاویل کا در کھلتا ہے اور معنی ہر بار نئی جہت اختیار کرتا ہے۔ یہی لامرکزیت، یہی مہابیانیے کی شکست، افتخار عارف کے کلام کو مابعد جدیدیت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

اردو غزل اپنی تہذیبی تاریخ میں ہمیشہ ایک جمالیاتی بیانیہ رہی ہے۔ ایک ایسا بیانیہ جو داخلی کیفیات، عاشقانہ رمزیت اور زبان کی تہذیبی بُنتر سے عبارت تھا۔ مگر جب عصرِ حاضر کے فکری دباؤ اور مابعد جدید نظریات کی سرحدیں اردو ادب سے آملیں، تو غزل کی کلاسیکی وحدت اور مرکزیت میں دراڑ پڑنے لگی۔ وہ غزل جو کبھی ایک متعین تجربے یا جذبے کو اظہار کی معراج سمجھتی تھی، اب خود اپنے معانی سے سوال کرنے لگی ہے۔

مابعد جدیدیت نے ادب کو نہ صرف نئے سوالوں سے آشنا کیا، بلکہ اس کی تاویلی ساخت کو بھی تہہ و بالا کر دیا۔ مابعد جدیدیت ایک ایسا فکری رجحان ہے جو بیسویں صدی کے وسط میں اپنے مکمل شباب کو پہنچا۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب انسان نے جدیدیت کی عصری خصوصیات کو سوالات کے تحت رکھا، جن میں مرکزیت، عقل اور سائنسی حقیقتوں کا تسلسل شامل تھا۔ مابعد جدیدیت نے ان تمام نظریات کو چیلنج کیا جو سچائی، علم اور حقیقت کو ایک ثابت و قائم مرکزی تصور میں سمو کر رکھتے تھے۔ یہ اصطلاحی طور پر ایسی ذہنی حالت کو بیان کرتی ہے جو معانی، حقیقت اور شناخت کے معیاری اصولوں کو بے بنیاد قرار دیتی ہے اور ان کی جگہ لچکدار، غیر مستحکم اور کثیر المعنٰی تصورات لے لیتی ہے۔

"There is nothing outside the text"[1]

اس جملے کے ذریعے دریدا نے ایک اہم تصور کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں متن (text) کو ہی حقیقت کی تخلیق کا بنیادی وسیلہ سمجھا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مفہوم یا معنی ہمیشہ ایک متن کے اندر ہی موجود ہوتا ہے اور اسے کسی خارجی حقیقت کے ساتھ جوڑا نہیں جا سکتا۔ اس حوالہ کو پیش کرنے کے بعد ہم یہ واضح کرتے ہیں کہ مابعد جدیدیت جدیدیت کے بعد ایک نیا فکری انداز تھا، جو ان تمام یقینوں اور نظریات کو رد کرتا تھا جو اس سے قبل حقیقت، معانی اور علم کے حوالے سے قائم کیے گئے تھے۔

مابعد جدیدیت میں ہم ایک ایسی حالت کو دیکھتے ہیں جہاں مفہوم اور سچائی لچکدار اور متغیر ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا دور ہے جہاں مرکزیت اور آفاقی سچائیوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے ہمیں ژاک دریدا کے نظریے کی طرف بڑھنا ضروری ہے، جس نے مابعد جدیدیت میں ردِ تشکیل (Deconstruction) کا تصور متعارف کرایا۔

ژاک دریدا کا ردِ تشکیل (Deconstruction) کا نظریہ مابعد جدیدیت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دریدا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ متن ہمیشہ غیر مستحکم اور مفہوم کی ملتوی نوعیت (Deferred) پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کے مطابق، ہر متن میں موجود زبان کی ساخت اور نظامِ معانی اتنے پیچیدہ اور متنازعہ ہوتے ہیں کہ کوئی بھی معنی کبھی بھی مستقل اور حتمی نہیں ہو سکتے۔

دریدا کے مطابق رد تشکیل کا مقصد یہ نہیں کہ ہم کسی خاص متن کی مفہومیت یا مقصد کو مسترد کریں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم متن کی محدودیت اور نظامِ معانی کی لچک کو اُجاگر کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی متن میں موجود ہر معنی کسی دوسرے معنی کے ساتھ جڑا ہوتا ہے اور کبھی بھی ایک نیا معنی (signified) نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ اس کے ساتھ ایک اور نئے نشان (signifier) کا اضافہ نہ کیا جائے۔

> "There is nothing outside the text.The text is not a linguistic structure, but a structure of structures. It is not simply the surface of a system, but a system of the system"[2]
>
> "متن سے باہر کچھ بھی نہیں۔ متن محض ایک لسانیاتی ساخت نہیں بلکہ ساختوں کی ایک ساخت ہے۔ یہ صرف کسی نظام کی سطح نہیں بلکہ خود نظام کا نظام ہے۔"

اس اقتباس میں دریدا نے واضح طور پر کہا ہے کہ متن کو کبھی بھی ایک مستقل حقیقت کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ یہ ہمیشہ نظامِ معانی کا حصہ ہوتا ہے جو آپس میں جڑا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ متن کا کوئی مفہوم کبھی بھی قطعی نہیں ہوتا اور اسے ہمیشہ دوسرے متون اور سیاق و سباق کے ذریعے تشکیل دیا جاتا ہے۔ رد تشکیل کا مقصد یہ ہے کہ ہم متن کی نظامی ساخت کو کھول کر اس کی مفہومی لچک اور غیر مستحکم نوعیت کو سمجھا جانا چاہیے۔

دریدا نے اس حقیقت کو ثابت کیا کہ معانی ہمیشہ ملتوی ہوتے ہیں، یعنی ان کا تعین اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ کسی اور متن یا مفہوم سے جڑ نہ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ دریدا کے مطابق، متن کبھی مکمل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی سچائی کا کوئی قطعی مرکز ہو سکتا ہے۔ اس طرح دریدا کی رد تشکیل کا نظریہ مابعد جدیدیت میں حقیقت کے معانی کی غیر مستحکم نوعیت کو واضح کرتا ہے اور مرکزیت کے مکمل خاتمے کی بات کرتا ہے۔

ژاک دریدا نے رد تشکیل (Deconstruction) کی تفہیم کے لیے مختلف اہم تصورات پیش کیے، جنہوں نے اس نظریے کو مزید گہرا اور پیچیدہ بنایا۔ ان تصورات میں سے بعض نے زبان اور معنی کے بدلتے ہوئے رویوں کو اُجاگر کیا، جبکہ دیگر نے مفہوم کی لچکدار نوعیت اور اس کے غیر مستحکم ہونے کو واضح کیا۔

دریدا کا Différance ایک بنیادی تصور ہے جو مفہوم کی ملتوی نوعیت کو بیان کرتا ہے۔ یہ لفظ "difference" فرق اور "deferral" ملتوی کرنا کے امتزاج سے آیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی معنی کبھی بھی قطعی طور پر نہیں بنایا جا سکتا، بلکہ ہر معنی دوسرے معنی کے ساتھ جڑ کر ملتوی ہوتا ہے اور فرق پیدا کرتا ہے۔ مفہوم ہمیشہ ایک دوسرے متن یا علامت کے ذریعے تشکیل پاتا ہے اور اس کا کوئی مستحکم مرکز نہیں ہوتا۔

Trace یا "نشان" دریدا کا دوسرا اہم تصور ہے۔ اس کے مطابق، ہر علامت یا لفظ میں ایک ماضی کی گونج اور ایک غائب مفہوم کا اثر موجود ہوتا ہے۔ ہر لفظ کے اندر ایک نشان چھپا ہوتا ہے جو اس کے پچھلے معانی یا اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ Trace کی موجودگی نے دریدا کے نظریے میں مفہوم کے لچکدار اور غیر مستحکم ہونے کا ایک نیا جہت شامل کیا۔

دریدا کے مطابق، مغربی فلسفہ اور ادب میں اکثر دوسری مخالف جوڑوں (binary oppositions) جیسے "وجود / غیاب"، "سچائی / جھوٹ" وغیرہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ دریدا نے ان جوڑوں کو غیر فطری اور غیر مستحکم قرار دیا اور یہ ثابت کیا کہ ان جوڑوں کے درمیان کوئی مضبوط تفریق نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جوڑے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور ان کا کوئی حتمی مرکز نہیں ہوتا، جس سے مرکزیت کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔

دریدا کا ایک اور اہم تصور ہے جس میں مغربی فلسفے کی زبان اور حقیقت کے مرکزی تصورات کو چیلنج کیا گیا Logocentrism ہے۔ یہ تصور بتاتا ہے کہ مغربی سوچ ہمیشہ لوگوس (logos) یا خود کو سچ ماننے والے مرکز کے ارد گرد گھومتی ہے۔ دریدا نے اس تصور کو رد کیا اور کہا کہ ہر زبان اور علامت کسی بھی حقیقت یا معنی کا مستحکم مرکز نہیں بن سکتی بلکہ وہ ہمیشہ غیر مستحکم اور مختلف تشریحات کی حامل ہوتی ہیں۔

دریدا نے Metaphysics of Presence یا "موجودگی کی مابعد الطبیعیات" کے تصور کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ مغربی فلسفے میں وجود (presence) کو ہمیشہ ایک مستحکم حقیقت سمجھا جاتا ہے، جس کا کوئی معین مرکز ہوتا ہے۔ دریدا نے اس موجودگی کو رد کیا اور کہا کہ ہر حقیقت یا مفہوم ہمیشہ غائب ہوتا ہے اور مختلف معانی میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

دریدا کے مطابق رد تشکیل کوئی مقررہ عمل نہیں ہے، بلکہ یہ ایک متحرک عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس کا مقصد کسی بھی متن یا معانی کو ایک مستقل حقیقت کے طور پر نہیں دیکھنا بلکہ اسے کھولنا اور اس میں چھپے ہوئے تناقضات اور نظام معانی کی لچک کو ظاہر کرنا ہے۔ رد تشکیل ایک ایسا تجزیہ ہے جو مرکز کے تصور کو تحلیل کرتا ہے اور نئے معانی کو مفہوم کے بہاؤ میں شامل کرتا ہے۔

دریدا کے بعد ژاں فرانسو لیوتار نے مابعد جدیدیت پر نمایاں کام کیا۔ ژاں فرانسوا لیوتار نے مابعد جدیدیت میں اپنے خاص طور پر اہم خیال "Death of Metanarratives" کو پیش کیا، جو اس بات پر مبنی تھا کہ وہ بڑی، آفاقی کہانیاں جو ماضی میں انسانوں کی اجتماعی حقیقتوں کو ایک مرکزیت فراہم کرتی تھیں، اب اپنی معنویت کھو چکی ہیں۔ اس کے مطابق مابعد جدید معاشرے میں علم اور سچائی اب صغیری بیانیوں میں بکھر چکے ہیں، جنہیں ہر فرد اپنے ذاتی تجربے اور ثقافتی پس منظر سے تشریح کرتا ہے۔

لیوتار نے اپنی کتاب The Postmodern Condition میں اس بات کو واضح کیا کہ مابعد جدید دور میں علم ایک لچکدار اور غیر مستقل نظام بن چکا ہے، جس میں ہر سماج اور ثقافت کی اپنی مخصوص سچائیاں ہیں۔

یہ نظریہ مابعد جدیدیت کی لامرکزیت کو اور بھی گہرا کرتا ہے اور اسے اس بات پر ایمان لانے کی اجازت دیتا ہے کہ حقیقت کبھی بھی ثابت نہیں ہو سکتی، بلکہ ہمیشہ متنازعہ رہتی ہے۔

> "Simplifying to the extreme, I define postmodern as incredulity toward metanarratives." [3]
>
> "انتہائی سادہ الفاظ میں، میں مابعد جدیدیت کی تعریف مہابیانیوں پر بے یقینی یا عدم اعتماد کے طور پر کرتا ہوں"

ژاں فرانسوا لیوتار نے میٹا نیریٹو (metanarrative) کے مقابلے میں ایک نئی اصطلاح متعارف کرائی، جسے "مقامی بیانیہ" (petit récit) کہا جاتا ہے۔ لیوتار کے مطابق، بڑے بیانیے جو عالمی حقیقت کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسے ترقی، آزادی یا مذہب، اب مابعد جدید دور میں اپنا استحکام کھو چکے ہیں۔ اس کی جگہ چھوٹے، مقامی بیانیے اُبھر کر سامنے آتے ہیں، جو مختلف افراد، گروہوں اور ثقافتوں کے ذاتی تجربات اور حقیقتوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔

لیوتار Petit Recits کو مقامی اور صغیری بیانیے کے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ ناصر عباس نیر نے Meta narrative کے لیے کبیری بیانیہ اور فوق بیانیہ کی اصطلاح استعمال کی ہے وہ کبیری یا فوق بیانیے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "لیوتار نے کبیری بیانیوں کی رکھنے کی جو تھیوری پیش کی ہے، اسے فوق بیانیہ (Metanamative) کا نام دیا ہے۔ فوق بیانیہ کبیری بیانیے کے چار اوصاف کو بہ طور خاص نشان زد کرتا ہے: آفاقیت، کلیت، یوٹوپیا اور اتھارٹی۔ یعنی ہر کبیری بیانیہ انسانی تجربے کے آفاقی ہونے کا تصور رکھتا ہے۔ تجربے کے اجزاء کے بجائے تجربے کی کلیت میں یقین رکھتا ہے اور انسانی تجربات کے تسلسل یا تاریخ کا خوش آئند یوٹوپیائی تصور رکھتا ہے۔ انسانی تاریخ کے سفر کو برابر ان کی طرف بڑھتے

ہوئے دیکھتا ہے۔ اسے اصطلاح میں تاریخ کا Teleological تصور قرار دیا گیا ہے۔ کبیری بیانیہ انسانی تجربے کے مستند اور مقتدر ہونے میں یقین رکھتا ہے۔"[4]

مقامی بیانیے انفرادی اور مخصوص تجربات کی نمائندگی کرتے ہیں اور غالب بیانیوں کے مقابلے میں لامرکزیت اور غیر مستحکمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بیانیے اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ حقیقت ایک مرکزی مرکز کے بجائے مختلف زاویوں سے جڑ کر تشکیل پاتی ہے اور مفہوم ہر نئے سیاق وسباق میں مختلف ہو سکتا ہے۔

ژاں فرانسوا لیوتار کی مابعد جدید فکر کا مرکزی محور مہابیانیے پر عدم یقین اور علم کی لا مرکزیت ہے۔ لیوتار نے "The Postmodern Condition: A Report on Knowledge" میں اس امر پر زور دیا کہ جدیدیت کے عہد میں قائم بڑے بیانیے جیسے ترقی، آزادی، عقل، اور سائنسی علم اب مابعد جدید شعور میں اعتبار کھو چکے ہیں۔ ان کے بقول، علم اب کسی جامع اور کلیاتی بیانیے کے تابع نہیں، بلکہ زبان کے چھوٹے چھوٹے کھیلوں (language games) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جہاں ہر بیان مخصوص سیاق و سباق، موقع اور معاشرتی مقام سے بندھا ہوتا ہے۔ لیوتار نے ان مہابیانیوں کے مقابل مقامی بیانیے (petit récit) کو ترجیح دی جو متنوع اور ذاتی سطح پر وجود میں آتے ہیں اور جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اب علم، شناخت اور معنی کو کسی ایک مرکز سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح لیوتار کا تصور معرفت کی مابعد جدید صورتحال کی ایک ایسی قرأت ہے جس میں حقیقت، زبان اور بیانیہ سبھی نسبتی، متغیر اور غیر مستحکم ہو جاتے ہیں اور یہی اس کے فکر کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔

مابعد جدیدیت کی فکری بنیادوں میں ژاک دریدا اور ژاں فرانسوا لیوتار کے نظریات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ دریدا نے "ردِ تشکیل" کے ذریعے اس خیال کو چیلنج کیا کہ کسی بھی متن کا مطلب ہمیشہ واضح اور حتمی ہوتا ہے۔ اس نے یہ بات اُجاگر کی کہ ہر تحریر کے اندر کچھ ایسے تضادات ہوتے ہیں جو کسی ایک طے شدہ معنی کو قائم نہیں رہنے دیتے۔ "Différance"، "trace" اور "undecidability" جیسے تصورات کے ذریعے دریدا نے بتایا کہ زبان میں معنی ہمیشہ ادھورے اور مؤخر ہوتے رہتے ہیں۔ ادھر لیوتار نے "مہابیانیے" پر اعتماد ختم کرنے کی بات کی اور اس کے بجائے "مقامی بیانیے (petit récit) جیسے نظریات کو پیش کیا، جو مختلف زاویوں سے دنیا کو دیکھنے کا موقع دیتے ہیں۔ ان دونوں مفکرین کی سوچ ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ علم، حقیقت اور خوبصورتی جیسے تصورات اب کسی ایک مرکز یا اصول کے تابع نہیں، بلکہ یہ سب کچھ وقت، مقام اور سیاق کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

اسی فکری زمین پر کھڑے ہو کر، جب ہم اردو غزل کی طرف دیکھتے ہیں تو یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا اس کلاسیکی صنف میں بھی مابعد جدید لامرکزیت اور بیانیاتی انکار کے اثرات موجود ہیں؟ خاص طور پر پاکستانی غزل، جس نے نوآبادیاتی تجربے، ہجرت، ریاستی بیانیے، شناختی الجھنوں اور تہذیبی اضطراب کو اپنے اندر سمویا، یوں غزل ایک ایسی صنف بن جاتی ہے جو مہابیانیے کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ہم اس مطالعے میں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کس طرح افتخار عارف کی غزل، بظاہر روایتی لب و لہجے میں ڈھلی ہوئی ہونے کے باوجود، معنی کی لا مرکزیت، بیانیہ کی شکست اور وجودی بے یقینی جیسے عناصر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس مطالعے میں ہم دریدا کے لسانی تجزیے اور لیوتار کے بیانیاتی تصور کو ایک تنقیدی منہج کے طور پر اختیار کرتے ہوئے افتخار عارف کی غزل کے منتخب اشعار کا تجزیہ کریں گے، تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ کس طرح ان کا کلام مابعد جدید فکر کی جمالیاتی اور فکری جہات کی نمائندگی کرتا ہے۔

افتخار عارف کی غزل کا لامرکزیت کے تناظر میں جائزہ

افتخار عارف کی غزل، اپنی تہہ دار زبان، رمزیت اور کلاسیکی جمالیات کے باوجود، مابعد جدید فکر کے تناظر میں ایک نیا معنیاتی اُفق پیدا کرتی ہے۔ اس کے اشعار محض روایت کے تسلسل کا اظہار نہیں بلکہ وہ ایسے بیانیاتی اور لسانی خلا بھی پیدا کرتے ہیں جو معنی کی مرکزیت کو متزلزل کرتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دریدا کا ردِ تشکیلی منہج ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ متن صرف وہ نہیں جو بظاہر نظر آئے، بلکہ وہ بھی ہے جو غائب ہے، موئخر ہے اور تضاد کے پہلو میں پوشیدہ ہے۔ عبد العزیز ساحر "افتخار عارف شخصیت و فن" میں رقمطراز ہیں:

"افتخار عارف کی غزل کی عمومی فضا دینی، تہذیبی اور ثقافتی حوالوں سے مزین ہے۔ وہ دینی روایت سے جڑے ہوئے شاعر ہیں ان کے کلام میں مذہبی اور متصوفانہ رویے تخلیقی آہنگ کی تاب اور توانائی سے مملو ہو کر منعکس ہوتے ہیں۔ ان کی غزل میں حمدیہ، نعتیہ اور متصوفانہ اشعار کی جمالیاتی معنویت فکر و آہنگ کا ایسا اشاریہ مرتب کرتی ہے، جو شاعر کی فکری معنویت کا غماز ہے ان کے کلام میں تیقن کی فضا اور ان کے لہجے کی فکری رعنائی ان کے دینی طرزِ فکر سے پھوٹی ہے۔ وہ گمان اور تشکیک کے صحراؤں میں زندہ رہنے کے بجائے یقین اور ایمان کے موسموں میں زندگی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔
[5]"

افتخار عارف کی غزل میں ہمیں ایسے اشعار بارہا ملتے ہیں جن میں مرکزی معنی کی گرفت سے بچ کر معنی کی تاخیر (Différance) ، نشانی کی عدم تکمیل (trace) اور حتمی مفہوم سے انکار (undecidability) کی فضا قائم ہوتی ہے۔ ہم اس مطالعے میں ان اشعار کو ردِ تشکیلی آنکھ سے دیکھتے ہوئے یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ افتخار عارف کی شاعری کس طرح لامرکزیت کی جمالیاتی اور فکری روح کی ترجمان بن جاتی ہے۔

جیتا ہوا میدان کہ ہاری ہوئی بازی
اس خانہ خرابی کی اذیت سے ملا کیا[6]

یہ شعر دراصل ایک دوہری ساخت پر قائم ہے، جہاں "جیت" اور "ہار"، "میدان" اور "بازی"، "اذیت" اور "حاصل" سب ایک دوسرے کی ضد کے طور پر سامنے آتے ہیں، لیکن کسی ایک معنی کو حتمی اور مرکزی حیثیت نہیں دی جاتی۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں دریدا کا "undecidability" فعال ہوتا ہے: کیا یہ جیت ہے یا ہار؟ شعر اس سوال کا جواب نہیں دیتا بلکہ دونوں امکانات کو ایک ساتھ رکھتا ہے اور قاری کو تذبذب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

دوسری طرف، "خانہ خرابی" کی ترکیب ایک ایسی لغوی خلاء کی نمائندگی کرتی ہے جہاں کسی حتمی ساخت (structure) کا امکان نہیں۔ دریدا کے تصور "différance" کے تحت یہاں معنی مسلسل موئخر ہو رہا ہے، ہم سمجھنا چاہتے ہیں کہ آخر اس اذیت سے کیا حاصل ہوا، لیکن شعر بار بار اس امکان کو رد کرتا ہے اور تضاد میں معنویت تلاش کرتا ہے۔

"اذیت" کا مفہوم بھی علامتی سطح پر غیر مستحکم ہے، کیا یہ نفسیاتی اذیت ہے، شکست کا دکھ ہے یا کسی داخلی انتشار کا عکس؟ شعر ہمیں ایک خلا میں چھوڑ دیتا ہے، جہاں مفہوم مکمل طور پر دستیاب نہیں بلکہ ہمیشہ التواء میں ہے بالکل ویسا ہی جیسے دریدا کا "trace" ، جو غائب ہوتے ہوئے بھی موجود رہتا ہے۔

اس شعر میں نہ کوئی مرکزی سچ ہے، نہ کوئی قطعی جذبہ۔ "میدان" ہو یا "بازی"، "جیت" ہو یا "ہار"، سب کچھ نسبتی اور متزلزل ہے۔ یہ وہی فضا ہے جس میں لامرکزیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے، مرکز تحلیل ہو جاتا ہے اور قاری کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ متن کو نئے زاویوں سے دیکھے، بیک وقت کئی معنوں میں پڑھے اور کسی ایک قطعی تشریح پر نہ ٹھہرے۔

لہو کی آگ میں جل بجھ گئے بدن تو کھلا

رسائی میں بھی خسارہ ہے نارسائی میں بھی (کتاب: دل و دنیا، ص317)

یہ شعر بظاہر دکھ اور ناکامی کا بیان ہے، لیکن جب ہم اسے ردِ تشکیل کے نظریے سے دیکھتے ہیں، تو یہاں ہر بات اپنی ضد کے ساتھ جڑی نظر آتی ہے۔ "لہو کی آگ" اور "جل بجھ گئے بدن" یہ دونوں استعارے زندگی اور موت، شدت اور خاموشی کو ایک ساتھ پیش کرتے ہیں۔ "جلنا" زندگی کی شدت ہے اور "بجھ جانا" موت کا اشارہ، لیکن شاعر ان دونوں کو ایک ہی لمحے میں اکٹھا دکھاتا ہے۔ مطلب یہ کہ شعر ہمیں کسی ایک صاف مطلب پر نہیں لے جاتا بلکہ ہمیں اس تضاد میں رکھتا ہے۔

دوسرا مصرع

رسائی میں بھی خسارہ ہے نارسائی میں بھی

یہاں "رسائی" یعنی کسی چیز کو پالینا اور "نارسائی" یعنی اسے نہ پاسکنا۔ دونوں کو شاعر نقصان یا خالی پن کے ساتھ جوڑتا ہے۔ گویا چاہے ہم کسی منزل تک پہنچ جائیں یا نہ پہنچ پائیں، آخر میں احساس ایک جیسا ہے: ادھورا پن، کمی، خلا۔ یہی وہ خیال ہے جسے دریدا "Undecidability" کہتا ہے یعنی کوئی بات، کوئی مفہوم، کوئی جذبہ پوری طرح طے نہیں ہو سکتا۔ ہم ہمیشہ شک میں رہتے ہیں اور ہر مطلب کئی مطلبوں میں بٹ جاتا ہے۔

یہ شعر ہمیں کسی ایک سچ یا معنی پر نہیں ٹھہراتا۔ افتخار عارف یہاں دکھاتے ہیں کہ زندگی کے بڑے تجربے، چاہے وہ کامیابی ہو یا ناکامی کبھی مکمل نہیں ہوتے۔ ہر تجربہ، ہر احساس ایک ادھوری، متزلزل کیفیت رکھتا ہے۔ اسی لیے یہ شعر لامرکز ہو جاتا ہے: کوئی "مرکز" یعنی قطعی مطلب موجود نہیں۔ ہمیں اس شعر کو بار بار پڑھنا پڑتا ہے اور ہر بار ایک نیا مفہوم سامنے آتا ہے۔

حامی بھی نہ تھے منکرِ غالب بھی نہیں تھے

ہم اہلِ تذبذب کسی جانب بھی نہیں تھے (کتاب: دل و دنیا، ص185)

یہ شعر ایک دھندلے، غیر متعین مؤقف کی تصویر پیش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ نہ وہ غالب کے حامی تھے، نہ منکر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک حتمی فیصلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ نہ تو وہ کسی بیانیے یا روایت کو مکمل طور پر تسلیم کرتے ہیں، نہ ہی انکار کرتے ہیں۔ یہ لامتناہی التواء (endless deferral) کی حالت ہے جسے دریدا "différance" کے ذریعے بیان کرتا ہے یعنی کسی ایک مفہوم تک پہنچنا ہمیشہ ایک عملِ التواء میں رہتا ہے اور ہر فیصلہ ایک نیا شک پیدا کرتا ہے۔

دوسرے مصرعے میں شاعر نے خود کو "اہلِ تذبذب" یعنی شک میں مبتلا افراد کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ "تذبذب" کوئی مضبوط، ایک طرفہ مؤقف نہیں ہے بلکہ یہ ایک غیر مستحکم، متزلزل حیثیت کی عکاسی کرتا ہے، جہاں ہر چیز شک میں ڈوبی ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لامرکزیت نظر آتی ہے۔ اس شعر میں کسی واضح مرکز کا غائب ہونا اور شک و تذبذب کی حالت کو ردِ تشکیل کے ذریعے سراہا جاسکتا ہے۔

یہ شعر ہمیں کسی مرکزیت یا یقینی سچ کی طرف نہیں لے جاتا۔ یہ کسی حتمی نتیجے یا کلی تعریف کو رد کرتا ہے اور ہمیں ایک لامرکز، غیر متعین حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ شاعر نے اپنی وجودی حالت کو نہ اِس طرف، نہ اُس طرف دکھا کر ایک لامرکز نظریہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ افتخار عارف یہاں ایک غیر مرئی مرکز کے نہ ہونے کی حالت کو بیان کرتے ہیں، جس میں ہر فیصلہ ایک نئے سوال کو جنم دیتا ہے اور ہر یقین اپنی ضد سے ٹکراتا ہے۔

آرزوؤں کا ہجوم اور یہ ڈھلتی ہوئی عمر
سانس اُکھڑتی ہے نہ زنجیرِ ہوس ٹوٹتی ہے (کتاب: دل و دنیا، ص375)

پہلے مصرعے میں "آرزوؤں کا ہجوم" ایک بے قابو، پھیلا ہوا منظر ہے، جو زندگی کی حرارت کو ظاہر کرتا ہے، مگر ساتھ ہی "ڈھلتی ہوئی عمر" اس زندگی کی زوال پذیری کو بیان کرتی ہے۔ یہاں زندگی کی طلب اور موت کی چاپ ساتھ ساتھ چلتی ہے، یہی وہ دوئی (binary opposition) ہے جو دریدا کے نزدیک ہر متن میں موجود ہوتی ہے اور جسے وہ ردِ تشکیل کے ذریعے غیر مستحکم کر دیتا ہے۔

دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہے

سانس اکھڑتی ہے نہ زنجیرِ ہوس ٹوٹتی ہے

یہاں بھی ایک نہ ختم ہونے والی درمیانی کیفیت ہے۔ سانس رک نہیں رہی، مگر سکون بھی نہیں، خواہش مر نہیں رہی، مگر پوری بھی نہیں ہو رہی۔ گویا زندگی اور موت، خواہش اور تکمیل، سب ادھورے، معلق اور غیر متعین ہیں۔

یہ شعر ہمیں کسی ایک انجام، ایک پیغام یا ایک فیصلہ تک نہیں پہنچاتا۔ یہ ایک مسلسل التواء (deferred meaning) میں رکھتا ہے، جیسا کہ دریدا کی "différance" کا مفہوم ہے جہاں ہر معنی، اپنی ضد کے ساتھ گتھم گتھا ہے۔ افتخار عارف یہاں کسی مہابیانیے کا علم نہیں اُٹھاتے، وہ یہ نہیں کہتے کہ خواہش بُری ہے یا بڑھاپا افسوسناک۔ بلکہ وہ ہمیں اسی تذبذب میں جیتے ہوئے دکھاتے ہیں جہاں ہر جذبہ اپنی ہی نفی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش
عذابِ دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے (کتاب: دل و دنیا، ص176)

افتخار عارف کا یہ شعر ایک دلی تذبذب اور وجودی بحران کی عکاسی کرتا ہے، جو ردِ تشکیلی نظریے کے تحت اس کی غیر مستحکمی کو نمایاں کرتا ہے۔ اس شعر میں سوالات، کھلے مواقع اور دنیوی اذیت کی ایک پیچیدہ حقیقت نظر آتی ہے، جسے دریدا اور لیوتار کے نظریات کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے۔

یہاں "خانہ بدوش" کی اصطلاح ایک مستقل، روایتی مرکز سے بے گریز کی تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ خانہ بدوشی کوئی جغرافیائی، جسمانی مقام نہیں بلکہ ایک وجودی حالت ہے جس میں فرد اپنی شناخت اور مرکزیت کو کبھی مکمل طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ "ہر اک سے پوچھنا" ایک مسلسل غیر متعین حالت کی عکاسی کرتا ہے، جہاں سوال ہمیشہ موجود رہتا ہے، مگر اس کا کوئی حتمی جواب نہیں ملتا۔

دوسرے مصرعے میں "عذابِ دربدری" دراصل استحکام اور شناخت کی کمی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور شاعر یہ سوال کرتا ہے کہ کس کے گھر میں رک کر سکون پایا جائے؟ یہ ایک سوال ہے جو لامرکزیت (Decentering) اور وجودی بحران کی طرف لے جاتا ہے، جہاں ہر منزل مبہم اور غیر مستحکم ہے۔

یہ شعر دراصل ایک مقامی بیانیے (petit récit) کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں فرد کی شناخت اور مقصد کسی بڑے بیانیے یا حقیقت سے جڑا نہیں ہوتا بلکہ یہ انفرادی تجربے اور مقامی حقیقت پر منحصر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لیوتار کا "incredulity toward metanarratives" اور "petit récit" کی اصطلاح کام آتی ہے، کیونکہ شاعر کسی بڑے مرکزی بیانیے کو نہیں مانتا بلکہ اسے شخصی، متفرق حقیقتوں میں رہنا پسند آتا ہے۔

یہ شعر ہمیں ایک مخصوص جغرافیائی اور ذاتی بحران کی طرف لے جاتا ہے، جہاں ہر "گھر" ایک نیا سوال اور غیر مستحکم بیانیہ پیدا کرتا ہے اور اس میں مرکزیت کی کمی اور لامرکزیت کی موجودگی دونوں کی جھلک ملتی ہے۔

افتخار عارف کی غزل میں لامرکزیت اور ردِ تشکیلی کی گہرائی کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے، جہاں ہر مفہوم اور حقیقت ہمیشہ غیر مستحکم اور مبہم دکھائی دیتی ہے۔ شاعر کی زبان اور تخیل میں کوئی حتمی نقطہ یا مرکز نہیں ہوتا بلکہ ہر لفظ میں ایک خلا اور تذبذب کی صورت موجود رہتی ہے۔ ان کی غزل میں مفہوم کا تعین کبھی بھی مستقل نہیں ہوتا بلکہ ہر تصور، ہر جذبہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور پھر بھی اپنے آپ میں مکمل طور پر غیر متعین ہوتا ہے۔

غزل کے مختلف اشعار میں شاعر ایک ایسے وجودی بحران کا سامنا کرتے ہیں جہاں غالب اور مغلوب کے درمیان کی سرحد دھندلی ہوتی ہے اور ہر راستہ ایک اضطراب یا تذبذب کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہاں کامیابی اور ناکامی کی تفریق بھی ایک مستقل چیلنج بن جاتی ہے، جس میں ہر فیصلہ ایک دوسرے کو ملتوی کرتا ہے۔ اسی طرح شاعر کی آرزو اور خواہش بھی کبھی مکمل طور پر حقیقت میں نہیں ڈھل پاتیں اور یہ خیال ہمیشہ ایک غیر حتمی صورت میں رہتا ہے۔

افتخار عارف کی غزل میں "دربدری" اور "خانۂ بدوشی" کی تصویر بھی لامرکزیت کے تصورات کو مزید واضح کرتی ہے، جہاں ہر فرد اپنے تجربے میں مستقل نہیں رہتا اور کسی ایک مرکز یا بیانیے کا پیروکار نہیں ہوتا۔ ان اشعار میں مفہوم کی عدم حتمیت اور وجودی اضطراب کی جھلک نظر آتی ہے، جو دریدا کی "différance" اور "trace" کے تصور سے ہم آہنگ ہے۔

اس طرح افتخار عارف کی غزل ایک مقامی بیانیہ کی صورت اختیار کرتی ہے، جہاں ہر تجربہ اور ہر مفہوم اپنی نوعیت میں غیر متعین اور لامرکز ہے۔ شاعر کا کلام ایک ایسی غیر مستقل حقیقت کی عکاسی کرتا ہے جس میں کوئی بھی مفہوم یا مرکز حتمی نہیں ہوتا بلکہ ہر لفظ اور ہر تجربہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور پھر بھی اپنی مفہومیت میں غیر مستحکم رہتا ہے۔

افتخار عارف کی غزل کا ردِ تشکیلی جائزہ ہمیں ایک ایسی لامرکزیت کی طرف لے جاتا ہے جہاں ہر فکری جہت اپنے تضاد میں اُلجھی ہوتی ہے اور مفہوم ہمیشہ غیر مستحکم رہتا ہے۔ ان اشعار میں ایک طرف مفہوم کا التواء اور غیر حتمیت ہے، تو دوسری طرف وجودی کشمکش اور انکارِ مرکز کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ عارف کا کلام دراصل ایک مقامی بیانیہ کی طرح کام کرتا ہے جہاں ہر فرد کا تجربہ مختلف اور غیر متعین ہوتا ہے اور کوئی حتمی سچائی یا مرکز موجود نہیں ہوتا۔ اس طرح افتخار عارف کی غزل میں ردِ تشکیلی اور لامرکزیت کا ایک طاقتور اظہار موجود ہے، جو مابعد جدیدیت کے نظریات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

افتخار عارف کی غزل کا مہابیانیے کے تناظر میں جائزہ

افتخار عارف کی غزل میں مہابیانیے کے رد کی گونج واضح طور پر سنائی دیتی ہے، جہاں شاعر نے فرد کے داخلی تجربات اور ذاتی حقیقتوں کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں کوئی ایسا مکمل بیانیہ نظر نہیں آتا جو تمام تجربات کو یکجا کر کے ایک قطعی سچائی تک پہنچائے۔ مہابیانیے کا جو مقصد بڑے، ہمہ گیر اور کل وقتی سچائیاں پیش کرنا ہے، اس کے برعکس عارف کی غزل میں سچائی ہمیشہ نسبتی اور غیر مستحکم دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر فتح محمد ملک افتخار عارف کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "جس زمانے میں افتخار عارف نے اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ زمانہ ہمارے ہاں دار و رسن کی پرچھائیں سے فرار، عمل کی رائیگانیت پر اصرار اور زندگی کی بے معنویت کے فلسفیوں کے پرچار کا زمانہ تھا نوجوان لکھنے والے 36 کے باغیوں کے خلاف بغاوت کی دھن میں زندگی ہی سے منہ موڑے بیٹھے تھے اور ادیب کی سماجی ذمہ داری اور ادب کے انقلابی کردار

کے تصورات کو متبذل گردانتے لگے تھے ۔ افتخار عارف اس رسم و رہِ عام سے ہٹ کر چلے اورانہوں نے معاشرتی اور تہذیبی وابستگی کو اپنے فن کا بنیادی حوالہ بنایا۔"[7]

یہاں نہ تو کوئی کلی حقیقت پیش کی جاتی ہے اور نہ ہی کسی واحد بیانیے کو اہمیت دی جاتی ہے۔شاعر کے اشعار میں فرد کا تجربہ مقامی بیانیے کی صورت میں اُبھرتا ہے، جو ہر شخص کی انفرادی حقیقت اور اس کے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہوتا ہے اور یہ ہر وقت مختلف اور بدلتا رہتا ہے۔ اس طرح افتخار عارف کی غزل میں مہابیانیے کے رد کا عمل ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جہاں وہ بڑے بیانیوں کو تسلیم کرنے کی بجائے، انفرادی سطح پر متنوع اور متغیر تجربات کو اہمیت دیتے ہیں۔

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں

عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی (کتاب: دل و دنیا، ص200)

افتخار عارف کا یہ شعر لیوتار کے مہابیانیے کے رد کے تناظر میں ایک اہم سوال اُٹھاتا ہے، جہاں وہ اجتماعی بیانیے کے اثرات کو چیلنج کرتے ہیں۔

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں

میں شاعر نے اس طاقتور مرکز کی تصویر کشی کی ہے جو افراد کی آزادی کو جکڑ دیتی ہے۔ یہ مجموعی بیانیہ یا مہابیانیہ کی علامت ہے، جو ایک بڑی اور حتمی حقیقت کو مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد "عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی" میں ایک انفرادیت کی بات کی جا رہی ہے، جو اس اجتماعی بیانیے کی طاقت کو رد کرتی ہے۔ یہاں دعا نہ مانگنے کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ فرد کی خواہشات اور تجربات کو ایک حتمی سچائی میں گم کر دیا جاتا ہے اور فرد اپنے ذاتی تجربات سے دور کر دیا جاتا ہے۔

لیوتار کے نظریے کے مطابق، مہابیانیے ہمیشہ ایک حتمی سچائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو افراد کے متنوع تجربات کو یکجا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر افتخار عارف کا یہ شعر اس بیانیے کی مرکزیت کو رد کرتا ہے اور مقامی بیانیے (petit récit) کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے، جس میں فرد کا ذاتی تجربہ اور اس کی انفرادیت مرکزی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ اس طرح یہ شعر ایک لامرکزیت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں سچائی کا کوئی واحد اور حتمی بیانیہ نہیں ہوتا بلکہ ہر فرد کا تجربہ اور اس کی حقیقت الگ ہوتی ہے۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے

وہ قرض اُتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے (کتاب: دل و دنیا، ص185)

افتخار عارف کا یہ شعر وطنیت کے مہابیانیے کو چیلنج کرنے کی ایک واضح مثال ہے، جو اکثر ایک جامع، حتمی اور مرکزی سچائی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ "مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے" میں مٹی یا وطن کی محبت کو ایک نظریاتی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو کہ قومی شناخت اور وطنیت کے حوالے سے ایک عالمی بیانیے کی عکاسی کرتی ہے۔ لیکن عارف یہاں اس بیانیے کو سوالات کے ساتھ پیش کرتے ہیں، کیونکہ وہ اسے ایک انفرادی تجربے یا مقامی بیانیے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ وطن کو صرف ایک اٹل حقیقت یا اجتماعی سچائی کے طور پر تسلیم نہیں کرتے بلکہ اسے ایک نسبتی سچائی کے طور پر دیکھتے ہیں۔

"وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے" میں شاعر نے وطن سے محبت کے جذبات کو سماجی جبر یا مجموعی بیانیے کے طور پر پیش کیا ہے، جسے افراد پر مسلط کیا جاتا ہے حالانکہ یہ قرض یا توقعات ان کے لیے ضروری نہیں تھیں۔ اس میں ایک لامرکزیت کی طرف اشارہ کیا گیا

ہے، جس میں شاعر کا خیال ہے کہ ہر فرد کا وطن سے تعلق اس کے ذاتی تجربات اور سمجھ بوجھ پر مبنی ہوتا ہے، نہ کہ کسی مرکزی یا حتمی سچائی کے تحت۔

لہٰذا یہ شعر وطنیت کے مہابیانیے کو چیلنج کرتا ہے، جو ہمیشہ ایک اٹل سچائی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ عارف اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ قومی محبت یا وطنیت کا تعلق افراد کے ذاتی تجربات سے ہے اور اسے ایک مجموعی بیانیے کے طور پر دیکھنا درست نہیں۔ وہ نسبتی سچائی اور لامرکزیت کو اُجاگر کرتے ہیں، جو دراصل لیوتار کے نظریات کے مطابق ہے۔

وہ جس کی جرأتِ پرواز کے چرچے بہت تھے
وہی طائر ہمیں بے بال و پر کیوں لگ رہا ہے (کتاب: دل و دنیا، ص195)

یہ شعر لیوتار کے مہابیانیے کی شکست اور انفرادی سچائیوں کے ظہور کو نہایت دردناک انداز میں بیان کرتا ہے۔ یہاں "جرأتِ پرواز" کسی عظیم رہنما، نظریے یا قومی امید کی علامت بنتی ہے، جو ماضی میں کسی بڑے خواب سے وابستہ رہا ہو، ایسا خواب جو پوری قوم کو جوڑنے، بلند کرنے یا راہ دکھانے کا وعدہ کرتا تھا۔ مگر جب یہی "طائر" یعنی وہ شخصیت یا نظریہ "بے بال و پر" دکھائی دے، تو گویا وہ عظیم تصور اپنی طاقت کھو چکا ہے۔ یہ تصویر اس لمحے کی ہے جب مہابیانیہ، جو خود کو کامل سچ، نجات دہندہ یا نکتۂ آغاز سمجھتا ہے، اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔

لیوتار کے مطابق یہ مہابیانیوں پر بے اعتباری (incredulity toward metanarratives) کا دور ہے، جہاں فرد کا تجربہ، مشاہدہ اور سوال زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ افتخار عارف کے اس شعر میں اسی مایوسی اور سوال کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ جن سے ہمیں امید تھی، وہ اب بے بس نظر آتے ہیں۔ یہ ایک فکری اور جذباتی سوال ہے، جو شاعر کی زبان سے نکل کر ایک پوری نسل کے اضطراب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہیں سے صغیری بیانیے (petit récit) کا آغاز ہوتا ہے، جو چھوٹے چھوٹے سچ، ذاتی تجربات اور غیر مرکزی نقطہ ہائے نظر کو اہمیت دیتا ہے۔ لیوتار کہتا ہے:

> "We no longer have recourse to the grand narratives — we can resort neither to the dialectic of Spirit nor even to the emancipation of humanity as a validation for postmodern scientific discourse. But as we have just seen, the little narrative [petit récit] remains the quintessential form of imaginative invention, most particularly in science."[8]
>
> "اب ہمارے پاس عظیم بیانیوں (grand narratives) کا سہارا نہیں رہا، ہم نہ تو روح کے جدلیاتی سفر (dialectic of Spirit) اور نہ ہی بنی نوع انسان کی نجات (emancipation of humanity) کو مابعد جدید سائنسی بیانیے کے لیے جواز کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے، صغیری بیانیہ (petit récit) ہی تخیّل کی ایجاد کی اصل صورت بنی ہوئی ہے، بالخصوص سائنس میں۔"

افتخار عارف کی غزل میں یہی ٹوٹا ہوا یقین، یہی سوال اور یہی انفرادی سچائی، مہابیانیے کے زوال کی ایک روشن علامت بن کر اُبھرتی ہے۔

آج کے بعد تو ہم پر بھی یہ لازم ہے کہ ہم
اپنی بوئی ہوئی فصلوں کو پرایا جانیں (کتاب: دل و دنیا، ص224)

افتخار عارف کا یہ شعر لیوتار کے مہابیانیے کے رد اور شکست کی ایک گہری علامت ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فرد اپنی تاریخ، اپنی شناخت، اور اپنی اجتماعی کوششوں پر خود سوال اُٹھاتا ہے۔ یہاں ''بوئی ہوئی فصلیں'' صرف مادی کوششوں کی نہیں بلکہ قومی خوابوں، نظریاتی وابستگیوں اور اجتماعی قوانین کی علامت بن جاتی ہیں، جنہیں ایک زمانے میں سچ سمجھ کر اپنایا گیا تھا۔

لیوتار کے مطابق مہابیانئے وہ بڑے بیانیے ہوتے ہیں جو قوم، تاریخ یا انسانیت کی نجات کے بڑے خواب دکھاتے ہیں۔ لیکن جب ان بیانیوں کی بنیادوں میں دراڑیں پڑتی ہیں، جب وعدے وفا نہیں ہوتے، جب اُمیدیں حسرت میں بدل جاتی ہیں، تو انسان اپنے ہی بیجوں، اپنے ہی فیصلوں اور اپنے ہی خوابوں سے بیگانہ ہونے لگتا ہے۔

افتخار عارف کا یہ شعر اسی لمحۂ شعور کا اظہار ہے جہاں اپنائی گئی سچائی اب بوجھ لگنے لگتی ہے اور اپنا اختیار کردہ راستہ اجنبی محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہی تو ہے postmodern incredulity یعنی وہ بے یقینی، جو انسان کو اپنے ماضی کے بیانیوں پر بھی شک کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہ شعر صغیری بیانیے کی طرف قدم بڑھانے کا اعلان بھی ہے، جہاں فرد اجتماعی تعبیرات سے نکل کر اپنی ذات کے چھوٹے، منتشر، مگر صداقت سے لبریز تجربات کو اہمیت دیتا ہے۔ افتخار عارف کی یہ غزل، مہابیانیے کے انہدام پر ایک زیرلب احتجاج ہے ایسا احتجاج جو سوال کی صورت ہے، شور نہیں۔

یہی ہے مصلحتِ جبرِ احتیاط تو پھر
ہم اپنا حال کہیں گے چھپا کے لہجے میں   (کتاب: دل و دنیا، ص 231)

یہ شعر افتخار عارف کی اُس لسانی باریکی اور فکری گہرائی کی ایک خوبصورت مثال ہے جہاں وہ بیانیے کی سطح پر ان کہی کو زبان دیتے ہیں اور زبان کی اندرونی کشمکش کو مابعد جدید لامرکزیت کے تناظر میں برتتے ہیں۔ یہاں "مصلحتِ جبرِ احتیاط " دراصل اس دَور کے اُس مرکزی بیانیے کی نمائندگی کرتا ہے جو اظہارِ ذات پر قدغن لگاتا ہے، فرد کو سنسر کرتا ہے اور سچ کو مخصوص دائرے میں قابو پانے والے بیانیوں کے تابع رکھتا ہے۔ لیکن "ہم اپنا حال کہیں گے چھپا کے لہجے میں "کا مصرع دراصل صغیری بیانیے (petit récit) کا اعلان ہے جہاں فرد مرکزیت کو تسلیم کیے بغیر اپنی تعبیرِ ذات کو خفیہ علامتوں، تمثیلات اور دبے ہوئے لہجوں میں بیان کرتا ہے۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں ژاک دریدا کا تصورِ "Undecidability" اور لیوتار کا "Incredulity toward Metanarratives" ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی بات قطعی ہے، نہ کوئی مرکز ناطق، بلکہ سب کچھ اپنی پوشیدہ پرتوں میں کہانی کا ایک نیا رخ بیان کر رہا ہے۔ افتخار عارف کا یہ شعر ہمیں اُس داخلی سچ کی جھلک دکھاتا ہے جو اظہار کی نہیں، اشارت کی زبان بولتا ہے۔ یہ لامرکز فضا ہی دراصل مابعد جدید شعور کی وہ جمالیاتی سطح ہے جہاں زبان خاموش ہو کر بھی گونجتی ہے۔

افتخار عارف کی غزل مہابیانیے کے اس جبر کے خلاف ایک لطیف مگر گہرا احتجاج ہے، جو فرد کی داخلی سچائی کو اجتماعی صداقت کی سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے اشعار میں فرد کی آواز کسی متعین، قطعی اور حاکمانہ بیانیے کی تائید نہیں کرتی بلکہ وہ اس بیانیے پر ایک پرسکون مگر پراثر سوالیہ نشان بن کر اُبھرتی ہے۔ افتخار عارف کے ہاں غزل صرف رومان یا جذبات کی نہیں بلکہ ایک فکری جدلیات کی زمین بن جاتی ہے جہاں شاعر اجتماعی دعووں، نظریاتی وعدوں اور تہذیبی دعووں کو حرفِ آخر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔

ان کے اشعار میں وطن، خدا، دعاء، قبیلہ، روایت اور اقتدار—سب کے سب مہابیانیوں کی صورت میں موجود تو ہیں، مگر ان پر یقین کی جگہ تذبذب، تشکیک اور خاموش مزاحمت کی لہر نظر آتی ہے۔ شاعر قبیلے سے باہر کھڑا ہے، مگر کسی اور لشکر کا حصہ بھی نہیں، دعاء مانگتا ہے، لیکن

زنجیر باندھ کر وطن سے وابستہ ہے، مگر اس کی محبت میں ایسی قیمت چکاتا ہے جو واجب نہ تھی۔ یہ تمام اشارات بتاتے ہیں کہ افتخار عارف کا تخلیقی ذہن کبیری بیانیوں کے طے شدہ معانی سے انکار کرتے ہوئے صغیری بیانیوں کی بکھری، مگر صداقت سے بھرپور جہتوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔

لیوتار کے نظریے کی روشنی میں، افتخار عارف کی غزل دراصل اس عہد کی روح کی ترجمان ہے جہاں سچ، تاریخ اور تشخص کوئی ایک، مستحکم اور آفاقی بیانیہ نہیں رکھتے، بلکہ شاعر ہر سوال کو نئے سیاق و سباق میں، اپنے ذاتی وجود کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ یوں ان کا کلام ہمیں اس پس ماندہ مگر معنی خیز "petit récit" کی مثال دیتا ہے جہاں عظیم بیانیوں کا زوال اور فرد کی داخلی صداقت کا ظہور ساتھ ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔

افتخار عارف کی غزل کا لامرکزیت اور مہابیانیے کے رد کے تناظر میں مطالعہ کرتے ہوئے جو فکری مناظر سامنے آئے، وہ محض شاعری کے جمالیاتی لطف تک محدود نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں ایک فکری تحریک کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں مرکزیت کی ہر شکل چاہے وہ روایت کی ہو، مذہب کی، قومیت کی یا سچائی کی کسی نہ کسی زاویے سے چیلنج ہوتی نظر آتی ہے۔ دریدا کی ردِ تشکیلی منہاج کے تحت جب ہم معانی کی تاخیر، ناپائیداری اور تضاد کو دیکھتے ہیں تو افتخار عارف کی غزل گوئی میں یہ عناصر نہایت باریک مگر پختہ صورت میں موجود پاتے ہیں۔ الفاظ کسی ایک مرکز کی طرف اشارہ کرنے کی بجائے مختلف سمتوں میں پھیل جاتے ہیں اور ہر شعر گویا اپنے باطن میں ایک سوالیہ کائنات رکھتا ہے۔

دوسری طرف، لیوتار کی مہابیانیوں کے خلاف بغاوت اور مقامی بیانیے (petit récit) کو ترجیح دینے کا جو رجحان ہے، وہ افتخار عارف کے ہاں کچھ یوں اُبھرتا ہے کہ شاعر کسی بھی آفاقی سچ، کسی بھی مروّجہ تاریخی بیانیے یا نظریے کو بلا تردد قبول نہیں کرتا۔ اس کے ہاں ہر سچائی سوال کے کٹہرے میں ہے اور ہر یقین کے نیچے اضطراب کی ایک خفی لہریں بہتی ہیں۔ یہاں غزل نہ صرف جمالیاتی اظہار ہے بلکہ ایک فکری مزاحمت بھی ہے، جو قاری کو دعوت دیتی ہے کہ وہ ہر مفروضے، ہر روایت اور ہر "مقدس" سچائی کو نئے سیاق میں پرکھے۔

یوں افتخار عارف کی غزل ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ مابعد جدید تنقید صرف مغرب کی فکری زمین سے پھوٹنے والا ایک زاویۂ نظر نہیں بلکہ اس کی گونج ہماری اپنی تہذیب، سیاست اور تاریخ میں بھی سنی جا سکتی ہے اگر ہم تخلیقی متون کو اس حساسیت سے پڑھیں۔ اس جائزے کا حاصل یہی ہے کہ غزل جیسے کلاسیکی صنفِ سخن میں بھی مابعد جدید فکر کی لہریں اپنا راستہ بنا سکتی ہیں اور افتخار عارف جیسے شعراء ان لہروں کو ایک گہری شعری زبان میں ہم تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس تجربے نے نہ صرف غزل کو نئے فکری دریچوں سے روشناس کیا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ اردو شاعری بھی عالمی فکری مکالمے میں اپنے مخصوص لہجے کے ساتھ شامل ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات:

[1] Jacques Derrida, *Of Grammatology*, trans. Gayatri Chakravorty Spivak (Baltimore: Johns Hopkins University Press, 1976), 158.

2 ایضاً، ص158-159۔

[3] Jean-François Lyotard, *The Postmodern Condition: A Report on Knowledge*, trans. Geoff Bennington and Brian Massumi (Minneapolis: University of Minnesota Press, 1984), 24.

4 ناصر عباس نیر، **مابعد جدیدیت** (نظری مباحث)۔

5 عبدالعزیز ساحر، **پاکستانی ادبی کے معمار: افتخار عارف شخصیت وفن**، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2009)، ص 77-78۔

6 افتخار عارف، **دل و دنیا (کلیات)**، (کراچی: پاکستان پبلشنگ ہاؤس، مکتبہ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ، 2012، ص342۔

7 افتخار عارف، **شہر علم کے دروازے پر**، (کراچی: مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز 2، عبداللہ ہارون روڈ، اکتوبر 2005)، ص129۔

[8] Jean-François Lyotard, *The Postmodern Condition: A Report on Knowledge*, trans. Geoff Bennington and Brian Massumi (Minneapolis: University of Minnesota Press, 1984), 60.